علی علیہ السلام اور سیاست

از قلم:

عبدُالکریم مشتاق

عبد الکریم مشتاق کی ایمان افروز مطبوعہ تحقیقی کتب

''دین ہماری سیاست ہے''

امام علی علیہ السّلام اور سیاست

از قلم

عبدالکریم مشتاق

باوا علی زر نقوی (مرحوم) اِسلامک ریسرچ سنٹر (فیصل آباد)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اے رسولؐ! کہہ دو آپ کہ میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا، میرا زندہ رہنا سب اللہ ہی کے لئے ہے۔" (القرآن - انعام ۲۰ع)

اسلام دین اکمل ہے۔ اس نے دنیا کا جو مذہبی تصور پیش کیا ہے۔ اس کے ماتحت اس نے اپنا تمام مذہبی، اخلاقی و معاشرتی نظام بنایا ہے۔ عقل و فطرت کو مذہبی عقائد کا آئینہ مقرر کیا ہے۔ عبادات کی بنیاد خود نوعِ انسانی کے مفاد پر رکھی ہے۔ اور اعتدال کو ایسا دائرہ بنایا جس میں افراط و تفریط کے گزر کیلئے کوئی راستہ ہی نہیں۔ اسلام نے انسان کی تمام صلاحیتوں میں تناسب و یکسانیت اور مختلف قابلیتوں میں ایک رشتۂ اتحاد پیدا کرنا چاہا۔ اس دینِ حقہ نے دنیا کا جو تصور پیش کیا وہ اس قدر فطری اور معقول ہے کہ اس کی فضا میں مذہب اور سیاست جدا نظر نہیں آتی۔ بلکہ یہ خیال بے بنیاد ہے کہ اسلام میں مذہب و سیاست دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اب ہم انشاءاللہ اس فلسفہ پر روشنی ڈالیں گے کہ نظمِ ملک اور مذہب کا کیا رشتہ ہے۔

اسلام دین و دنیا دونوں کا جامع ہے۔ بلکہ دنیا بھی دین ہی کا ایک شعبہ ہے۔ اور دنیوی فرائض کی ادائیگی کے بغیر دین نامکمل رہ جاتا ہے۔ انکی ادائیگی تعمیلِ حکمِ دین ہے۔ اس طریقہ پر اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔ چنانچہ دنیوی فلاح و سعادت اور قوم و ملت کی مادی ترقی کے جو احکامات و تعلیمات ہیں۔ انکی وہی اہمیت ہے جو خالص دینی احکام کی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا ایک نزدیک

یہ بھی ایک سبب ہے کہ انھوں نے دین و دنیا میں تفریق کردی۔ دین کو صرف تسبیح و مصلّٰی تک محدود کر لیا۔ اور زندگی کے دیگر شعبہ جات کو خارج از دین سمجھ لیا۔ حالانکہ جس طرح عبادات فرض ہیں اسی طرح قوم و ملّت کی شوکت و عظمت کے لئے ہر قسم کی جدّ و جہد اور دُنیوی تدابیر بھی فرض ہیں چنانچہ جہاد افضل العبادات ہے۔ اسی دنیا کا سب سے بڑا شعبہ "سیاست" ہے۔ اب ہم دیکھیں پروردۂ آغوشِ رسالت حضرت امیر المومنین علیؑ ابنِ ابی طالب علیہ السّلام نے دنیا کا کیا تصور پیش کیا۔ اور ان کی سیاست کیا تھی؟

حضرت علیؑ اور دنیا

وارثِ علمِ رسولؐ جناب علی علیہ السلام پہلے انسانِ کامل ہیں جنھوں نے دنیا کے متعلق اپنے ارشادات کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ آپ نے دنیا کا نقشہ جس انداز سے دکھایا ہے اس سے علوم و فنون، عبادات و معاملات کیلئے ایک عمدہ لائحہ عمل ملتا ہے۔ آپ کے خطاب و خطوط، اشعار و وصایا اور دیگر ارشادات دنیا کے متعلق ان کے اپنے نظریہ کی تشریح سے بھرے پڑے ہیں۔

مثلاً حضرت علیؑ نے فرار کی مذمّت کی خواہ وہ میدانِ جہاد سے ہو۔ یا دنیوی آلام و مصائب سے ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ محض لذّت اندوزی، عیش پرستی اور دولت کی ذخیرہ اندوزی کو ہی مقصدِ حیات سمجھ لینے کی سخت مخالفت فرمائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد از رسولؐ مسلمانوں نے بڑی فتوحات کیں۔ اور حدودِ سلطنت کو وسیع تر کیا۔ لیکن یہی فتوحات مسلمانوں کے مزاجِ روحانی پر کافی اثر انداز ہوئیں۔ خدا پرستی و معرفت کوشی گھٹ گئی، اور

ثروت اندوزی کی طرف توجہ بڑھ گئی۔ وفاتِ پیغمبرؐ کے فوراً بعد وہ دَور آگیا جس کے متعلق آپؐ پہلے ہی پیش گوئی فرما چکے تھے۔ خدا کی قسم مجھے یہ خوف نہیں کہ تم شرک کرو بلکہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم خزانوں کی محبت میں پڑ جاؤ گے (صحیح بخاری کتاب الرقاق)

جب اُموی دَور آیا تو حالات اس نہج پر آ گئے کہ مذہب میں لذّت کی مانگ بڑھ گئی۔ قوانینِ شریعتِ محمدیہؐ اور سیرتِ رسولؐ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بعض بعض جگہ اسلامی حکومت کے گورنر شراب میں مخمور ہو کر نماز پڑھانے لگے احکامِ شریعت میں نمایاں تبدیلیاں کی جانے لگیں مخلص عبادت گزار اور متّقی اصحابِ رسولؐ پر تشدّد ہونے لگا۔ قیصر و کسریٰ کی شان و شوکت اور دنیا کے متعلق حیوانی تصور عروج پانے لگا۔ مخلص مسلمانوں نے اُسے برداشت نہ کیا۔ اور مذہب و ملّت کے لئے خطرناک یقین کیا۔ اسلام ذہنی و عملی جہاد کے فائدہ سے کسی کو محروم نہیں کرتا۔ بنیادی حقوقِ حیات میں مساوات کا علمبردار ہے۔ لیکن عالم و جاہل، محنتی و کاہل کا سب ونکھٹو کے فرق کا قائل ہے۔ لیکن اُمویوں نے اپنی سرمایہ دارانہ پالیسیوں سے عوام کے وسائلِ حیات میں اتنا فرق پیدا کر دیا کہ بعض کے گھروں میں مال و زر کی فراوانی تھی۔ اور دوسری طرف عوام اتنے مفلوک الحال اور تنگ دست ہو گئے کہ نہ اُن کے پاس تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا تھا اور نہ کھانے کے لئے روٹی۔ محض وہی لوگ آرام کی زندگی گزار رہے تھے جو بنو اُمیہ کی اقربا پرورانہ پالیسیوں سے متمتّع ہوتے رہتے تھے۔

حضرت علیؑ اور ان کے حامی اس ہولناک منظر کو دیکھ کر بڑے غمگین تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس ماحول کے خلاف آواز بلند کی۔ اور اُموی

فائدہ اُٹھا کر اپنے جائز و ناجائز احکام تسلیم کروا رہے تھے۔ نفس پرستی کی دعوت دی جا رہی تھی۔ اسلئے آپ نے اپنے بیانات میں دنیا کی مذمت بھی فرمائی۔ تاکہ غربت سے تنگ آکر عوام دنیا کیلئے ایمان فروشی نہ کرے اور برسرِ اقتدار سرمایہ داروں کے ناجائز احکام کو قبول کرنے کیلئے شریعتِ محمدیہ کے احکام کو پسِ پشت نہ ڈالے۔ اور اس سے مراد وہی زنگ آلود دنیا ہے جس کا مذہب نفس پرستی اور لذت ہے۔ حضرت علیؑ کے بیانات کو جن میں انہوں نے دنیا کی مذمت کی ہے۔ اسی وقت صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب ان بیانات کو بھی سامنے رکھ لیا جائے جن میں دنیا کی مدح ہے حضرت نے ایک شخص کو قدح دنیا کرتے دیکھا تو آپ نے اُسے فرمایا "اے دُنیا کے فریب میں آکر دنیا کی مذمت کرنیوالے! تو اسکے فریب میں آکر پھر اسکی برائی کرتا ہے۔ تو اسکا مجرم ہے یا وہ تیری گنہگار ہے؟ اس نے تجھے کب حیران کیا؟ کس وقت فریب دیا؟ کیا تیرے آباو اجداد کی پرانی قتل گاہوں کے ذریعے سے تجھے اس نے فریب دیا؟ (یعنی یہ تمہاری عبرت کیلئے کافی تھیں) تو نے اکثر بیماروں کی دستگیری کی۔ اکثر بیماروں کیواسطے ہاتھ پاؤں مارے۔ انکی صحت کا طالب ہوا طبیبوں کے سامنے انکے حالات بیان کئے۔ مگر تیری ان شفقتوں اور مہربانیوں نے انہیں کچھ فائدہ نہیں دیا۔ کسی ایک کے بارے میں بھی تیرا مطلب پورا نہ ہوا۔ ایک مریض سے بھی اپنی قوت کے ساتھ بیماری کو نہ ہٹا سکا۔ دنیا نے اپنے کو اپنی مثالوں میں تیرے سامنے ظاہر کیا اور ان ہلاک ہونیوالوں کے لباس میں آکر بتا دیا کہ تو بھی ہلاک ہو جائیگا۔ دنیا اس شخص کیلئے ہے جو اسکی تصدیق کرے، ایک سچا مکان ہے۔ جو اسکو سمجھے اس کے لئے جنت کا گھر ہے جو اس سے کچھ لینا چاہے اس کے لئے تونگری کا مقام ہے۔ جو اس سے نصیحت

حاصل کرے۔ اسکے لئے نصیحت کی جگہ ہے۔ یہ دنیا عاشقانِ خدا کی عبادت کی جگہ ہے۔ یہ ملائکہ کی دعا کا مقام ہے۔ یہ وحیِ الٰہی کے نازل ہونے کی جگہ ہے۔ یہ عاشقانِ خدا کی تجارت گاہ ہے، وہ اس دنیا میں خدا کی رحمت حاصل کرتے ہیں۔ انھیں اسی دنیا میں جنت نفع میں ہاتھ آتی ہے۔ اب کون شخص دنیا کی برائی کر سکتا ہے۔ حالانکہ دنیا نے اپنی جدائی کی خبر دے دی ہے۔ اپنا اور اپنے اہل کا کچا چٹھا بیان کر دیا ہے۔ آخرت کی تکلیفیں اپنی زحمتوں کی تصویر میں پیش کر دی ہیں۔ اپنی خوش حالیوں کے سبب سے آخرت کے عیش و سرور کا انہیں مشتاق کر دیا ہے۔ اس نے عافیت و صحت کی حالت میں صبح کی، کہ شوق دلا کر ڈرا دھمکا کر خوف دلا کر اہلِ دنیا کو رنج و اندوہ پہنچا رہی ہے۔ یہ ندامت و پشیمانی کی صبح کیوقت اسکی مذمت کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو دنیا نے آخرت کی یاد دلائی۔ انہوں نے اسے یاد کر لیا۔ انھیں اپنے حالات کی خبر دی۔ انہوں نے اسکی تصدیق کی۔ انھیں نصیحت کی اور انہوں نے نصیحت قبول کر لی۔ ایسے لوگ دنیا کی مدح کرتے ہیں:

امامؑ عالیمقام کا یہ بیان بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس پر توجہ خاص کی ضرورت ہے۔ امام کے اس بیان پر حسبِ ذیل تبصرے قابلِ غور ہیں۔

دُنیا کی مذمت کا نقطۂ نظر

صرف اس پر مبنی ہے کہ انسان اپنی ناکامی کی ذمہ داری دنیا کی ناموزونیت اور ناواقعیت کے سر تھوپتا ہے۔ حالانکہ دنیا نہ بُری ہے نہ اچھی۔ بلکہ انسان اپنے تصورات کے ماتحت اسے اچھا اور بُرا بنا لیتا ہے۔

دُنیا کی صحیح شکل

دُنیا اپنے وجود کی خود آئینہ دار ہے۔ اس نے اپنے تاریک پہلو کو اپنے روشن پہلو سے زیادہ نمایاں کر رکھا ہے۔ اور انسان ہی کا قصور ہے کہ وہ اس کے تاریک پہلو پر غور و فکر نہیں کرتا۔ حالانکہ آباؤ اجداد کی اموات اور تمام تاریخی روایات اس کی حقیقت بیانی کی مثالیں ہیں۔

دُنیا آرام کا گھر کیسے بن سکتی ہے

اگر انسان نے اپنی کامیابی و ناکامی اور زندگی و موت کے صحیح تصورات قائم کر لئے ہیں۔ اور وہ تصورات دُنیا کی حقیقت کے ہم آہنگ بھی ہیں۔ تو یہ دُنیا حقیقت ہی حقیقت ہے جس انسان کو تکمیل فرائض کا احساس ہے اور وہ اس دُنیا کو دوسری دُنیا کا زینہ سمجھتا ہے تو اس کے لئے یہ دُنیا راحت کدہ ہے۔ اسلام میں عبادت کا مفہوم تکمیلِ فرائض کے سوا اور کیا ہے؟ امام کے اس فقرے سے "دنیا" عاشقانِ خدا کی تجارت گاہ ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ یہاں تکمیلِ فرائض سے آئندہ نئی زندگی میں صحیح مسرت حاصل ہو گی۔ امام کا فرمانا کہ دوستدارانِ خدا اس دُنیا میں خدا کی رحمت حاصل کرتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے تمام شعبوں میں موزونیت کا دوسرا نام ہے جس سے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

دَولت کا نظریہ

مادّی دَولت سے کبھی اطمینان و سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حقیقی اطمینان و سکون کیلئے ایک دوسری دَولت کی ضرورت ہے اور وہ عشقِ الٰہی ہے۔

دُنیا کے آلام کی حقیقت

اِنسان تکلیفیں جھیلنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان تکالیف کو اسکو دوسری زندگی کی تکالیف کا تصوّر کرنا چاہیئے یعنی یہاں کی تکالیف محرکِ احساس تکالیف ہیں۔ ناکام انسانوں کیلئے دنیا اپنی زحمتوں کے بھیس میں آخرت کی تکلیفوں کی تصویر پیش کرتی ہے۔

دُنیا کا عیش

یہ بھی محرکِ احساسِ لذّت ابدی ہے۔ خود مقصود نہیں ہے۔ دُنیا نے اپنی خوش حالی سے آخرت کے عیش و سرور کا اندازہ بتا دیا ہے۔

دُنیا کا غلط تصوّر اور انجامِ زندگی

جن لوگوں اور جن قوموں نے مادّی ترقی ہی کو منزل سمجھ لیا۔ اور دنیا کے تاریک پہلو سے بالکل آنکھیں بند کر لیں وہ کبھی کامیاب نہیں رہے۔ بلکہ انکو ایک کامیابی حاصل کر لینے کے بعد دوسری کامیابی کی تلاش ہوتی ہے۔ اور

اسی جدوجہد میں انکی زندگیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ اور انکی زندگی کے اصول میں صحیح توازن پیدا نہ ہونے کی وجہ سے انکی زندگی کی عمارت اندر ہی اندر کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ اور جب عمارت گر جاتی ہے تو وہ دُنیا پر اپنی ناکامیابی کی ذمہ داری رکھ دیتے ہیں۔ اور کفِ افسوس ملتے ہیں۔

دُنیا کے کامیاب انسان

وہ کامیاب اِنسان ہیں جو مادی پہلو کے ساتھ ساتھ روحانی پہلو کو زیرِ نظر رکھتے۔ اور روحانی پہلو کی ضرورت یہ دنیا خود پیش کرتی ہے جو لوگ اس دنیا کا صحیح تصور کرتے ہیں یعنی روشن اور تاریک دونوں پہلو زیرِ نظر رکھتے ہوئے اپنی دونوں زندگیوں کے لئے کوشاں ہیں۔ یہاں کے تاریک و روشن پہلو سے زندگی کے اصول بنالیتے ہیں۔ اور اسی پر اپنی زندگی کے نظریہ کی عمارت قائم کر لیتے ہیں وہ کامیاب رہتے ہیں۔ اور اس دنیا کی مدح کرتے ہیں۔

حضرت علیؑ کی شاہراہِ فکر و عمل

حضرت علی علیہ السلام کو یہ ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ کہ آپ نے ترقی پذیر زندگی کیلئے ہمہ گیر نظام سکھایا ہے۔ آپکی سیرۃ طیبہ روحانی و مادی نقطۂ نظر کی ترجمان ہے۔ زندگی بھر آپ کا بحرِ فصاحت ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ آپنے جو فرمایا یا تحریر کیا قرآن و حدیث رسول کی جامع تفسیر ہے اور آپکا کردار ایک مکمل شرح ہے۔ تاریخ خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کوئی

دوسری شخصیت اس جامعیت فکر و وسعتِ عمل کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اِنفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، دوستوں سے معاملہ ہو یا دشمنوں سے وہی طرزِ عمل تھا جو رضائے الٰہی کے مطابق تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ زبانِ وحی بیان سے یہ سند حاصل کی، کہ "اگر میرے بعد فتنے برپا ہو جائیں گے تو علیؑ کا دامن پکڑ لینا"۔ کیونکہ یہ حق و باطل میں فرق کرنے والے ہیں۔ یعنی فاروق ہیں (مشکوٰۃ) کوئی بھی مرحلہ ہو اطمینان ہو یا پریشانی ایک ہی کردار اور ایک ہی مسلک ہے۔ آپ کی صفاتِ کاملہ میں سے ایک یہ صفت خاص ہے کہ اقوال و افعال کا تضاد نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر مواقع پر اصحاب و ارباب کے مشورے سے بھی اختلاف ہوتا تھا۔ علماءِ تاریخ میں سے کچھ لوگوں نے بڑی سنگین غلطی کی ہے کہ انہوں نے جنابِ امیرؑ کی زندگی کا مطالعہ اصولِ زندگی کی روشنی میں نہیں کیا ہے جب تک یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت علیؑ کے نزدیک بہترین زندگی کا معیار کیا تھا؟ وہ خوش بختی کس کو سمجھتے تھے؟ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص حضرتؑ کی عمیق زندگی تک رسائی کر سکے حضرتؑ فرماتے تھے "حالات کی گردش میں کمالاتِ انسانی کا اظہار ہوتا ہے۔"

امیرالمومنین کے تمام واقعات اور اقوال بتاتے ہیں کہ حضرتؑ کے سامنے ایک معین راہِ عمل تھی جس سے وہ سرِ مو ہٹنا بھی نافرمانیٔ رسولؐ یقین فرماتے تھے۔ وہ رضائے خداوندی شاہراہ تھی جس کی تعمیر وحیِ الٰہی سے اسلام نے کی۔ سرورِ انبیاء کے بعد جس پر سب سے زیادہ روشن قدم حضرت علیؑ کے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کی شاہراہِ عمل کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کامیاب سیاست دان تھے یا نہیں؟ لیکن اس سے پہلے ہمیں مفہوم

سیاست اور وسعتِ سیاست کو جاننا چاہیئے۔ لغوی معنی "جانوروں کی دیکھ بھال
رعیت داری کرنا" ہیں "منجد" میں ہے کہ سیاست مصدر ہے۔ مخلوق کی اصلاح
بایں طور کہ فوراً یا مستقبل میں انہیں کامیابی ہو۔ ملکی سیاست سے مراد ہے عدل و
استقامت کی بنیادوں پر تدبیر معاش۔ انگریزی معنی (گورنمنٹ کا آرٹ یا سائنس
(ART OR SCINCE CF GOVT) آج کل یہی معنی ہیں۔

لیکن اسلام نے اس فن یا سائنس کی تعریف نہایت جامع کی ہے۔ یعنی
فنِ حکمرانی مگر پابندیٔ احکامِ خدا کے ساتھ، عوام کی خواہش اور عصری اقتدار کی
ہم آہنگی سے قطع نظر کرکے اسلام ایک نیا صالح معاشرہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اور
اس کے نزدیک مفہوم سیاست یہ ہے کہ حکومت میں حق و صداقت اور تقویٰ اصل
ہوں حضرت علیؑ کے نزدیک چونکہ سیاست نام تھا نفوذِ احکام خدا و رسولؐ کا اور
مولائے کائنات کی نظر میں چند مخصوص افراد کی نہیں بلکہ تمام عوام کی اجتماعی فلاح و
بہبود ہی تکمیل سیاست تھی۔ اگرچہ چند خود غرض اور شر انگیز سرمایہ داروں کے اثر
سے بگڑے ہوئے اذہان کی مالک اکثریت کی نظر میں یہ مفہوم سیاست غلط ہو
لیکن حضرت علیؑ، خدا اور رسولؐ کے احکام اور فلاح و بہبودِ انسانی کے خلاف
سرمایہ داری اور نافرمانیٔ خدا اور رسولؐ کی طرف نہ جھک سکتے تھے اور نہ کبھی
جھکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا عمل اسوۂ رسولؐ کے مطابق رہا۔ دنیا کی کوئی تاریخ یہ
ثابت نہیں کرتی کہ رسولؐ کے زمانے میں کوئی بیت المال تھا۔ لیکن چونکہ بعد میں
بیت المال کا قیام سنتِ رسولؐ کے خلاف عمل میں آچکا تھا اور مالِ غنیمت لوگوں
میں تقسیم ہونے کے بجائے یا کم از کم کلی طور پر تقسیم ہونے کے بجائے بیت المال میں

جمع ہونے لگا۔ اس لئے حضرت علیؑ نے حاکم (ظاہری) ہوتے ہی، بیت المال کا تمام
مال نکلوا کر تقسیم کروا دیا۔ بیت المال میں جھاڑو دلوادی جس کے معنی یہ ہیں کہ
حضرت علیؑ کے نزدیک سیاست کا مقصد خزانے قائم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اسوۂ
رسولؐ کے مطابق بھوکوں کی شکم پری، ننگوں کو کپڑا پہنانا، بیواؤں اور یتیموں کو نان و
نفقہ مہیا کرنا اور عوام کی اجتماعی فلاح و بہبود تھا۔ حضرت علیؑ کے نزدیک مخصوص
افراد کیلئے وظیفے دینے کے لئے رقم باقی رکھنا ضروری نہیں تھا۔ بلکہ وہ چاہتے تھے
کہ وہ رقم غریب عوام کے کام آئے۔ یہی مفہوم سیاست اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح
ہے۔ امیر المومنین نے اپنے آقا حضرت رسالتمآب کے بعد کبھی بھی سیاست
بالمقابل شریعت، کا مفہوم نہیں اپنایا۔ وہ خانہ نشین رہے۔ مگر دین و تبلیغ احکام
کے موقع پر نہیں۔ انھوں نے تخت و تاج کو ٹھکرا دیا اور حکومت حاصل کرنے
کے لئے کوئی سائنس یا آرٹ استعمال نہیں کیا۔ برسرِ اقتدار شخصیتوں کا سایہ نہیں
بنے۔ کچلے ہوئے عوام کی اصول فروشانہ لیڈری نہیں کی۔ مرکزِ حکومت سے
دور کسی علاقہ میں جاکر نہیں بیٹھے۔ سرمایہ تھا مگر ذخیرہ اندوزی نہیں کی۔ دنیوی
حاکم تسلیم کرلئے گئے تو قبائل کے سرداروں اور روم و ایران کے بادشاہوں کے
انداز نہیں اپنائے۔ فقیرانہ وضع۔ خالص قرآن و سنت کی زندگی۔ حق گوئی بیباکی۔
فاقہ کشی و جفاکشی کو اپنایا۔ بادشاہ تھے مگر مزدوری کرتے رہے۔ بیت المال
ہی ختم کردیا تھا۔ تو وظیفے کہاں سے لیتے۔ نہ تو رسولؐ نے کوئی وظیفہ لیا تھا۔ اور
نہ حضرت علیؑ نے لیا۔ "فنِ حکمرانی شریعت کے مقابل آرٹ" کو ان کے رہنمائے
اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی نسبت نہ تھی۔

بیشک لوگوں نے مشورے دیئے کہ فلاں فلاں کام نہ کریں، بلاشبہ حضرت نے مدینہ چھوڑ دیا۔

یقیناً جنگِ جمل کے شکست خوردہ لوگوں کو جنگ کے بعد سختیوں کا نشانہ نہیں بنایا۔ کہ دوسروں کی ہمت نہ بڑھتی۔ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ جنگِ صفین میں عوام اور سپاہیوں کو سبز باغ دکھا کر لڑائی کا گرویدہ نہیں رکھا۔ روادار لیڈروں کو فتح کے بعد جاگیریں دینے کے وعدے نہیں کئے جنگ کو آخری منزل پر پہنچانے سے پہلے تلوار روک لی۔ مگر ان مواقع پر امیر المومنین نے کسی موقع پر بھی شریعت حق اور تبلیغ و حکم و اصولِ دین میں کوتاہی روا رکھی ہو تو بتایئے؟ دین کا کوئی بھی حکم نظر انداز کیا ہو تو کہئے کہ سیاسی غلطی ہوئی۔ اور جب ایسا نہیں ہوا تو اپنے خیالات کی اصلاح کیجئے۔ حضرت علیؑ کی نظر میں مفہوم سیاست یہ ہے کہ "فنِ دین پناہی" آرٹ آر سائنس آف ایمان "عمل بر شریعت حقہ"۔ اس مختصر سی وضاحت کے بعد ہم حضرت علیؑ کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں جن سے ان کے موقفِ سیاست کی توضیح ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا پورا ذمہ دار ہوں اور جواب دہ ہوں۔ یاد رہے کہ جس پر عبرتیں اور ماضی کے واقعات واضح ہوں۔ اسے احتیاط شبہ کے مقامات پر بے تحاشا پیش قدمی سے روکتی ہے۔ یاد رکھو تمہاری وہی پریشان حالیاں پھر پلٹ پڑی ہیں جو بعثتِ نبویؐ کے وقت تھی جس خدا نے آنحضرتؐ کو حق کے ساتھ بھیجا اسکی قسم اب پھر تم اچھی طرح پلٹے اور انقلاب سے دوچار کئے جاؤ گے پھر تمہیں چھان پھٹک کر الگ کیا جائے گا اس کے بعد دیگ کے چاولوں کی طرح اُلٹ پلٹ کیا جائے گا۔ کہ تم میں سے جو نیچے جا پڑے ہیں۔ وہ اپنے جوہرِ ذاتی سمیت اوپر آئیں اور جو سردار بن بیٹھے ہیں۔ وہ پھر اپنی پستیوں میں جائیں جنہیں آگے بڑھنا چاہیے تھا اور نہ

بڑھ سکے انہیں آگے ہونا پڑے گا۔ اور جو تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ انھیں پیچھے ہٹنا ہوگا۔

ان الفاظ میں حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے سیاسی موقف حکومت و عوام کے پس منظر مستقبل کے طریق کار اور اپنے نقطۂ نظر کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ کیا اس جیسے ملفوظات کے بعد کوئی ہے۔ جو علی ابن ابیطالبؑ کی سیاست کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ اور وہ یہ نہ معلوم کر سکے گا کہ یہ وہ طریق کار اور واضح پالیسی ہے۔ جو قرآن کے عین مطابق اور شریعت کے موافق ہے۔

حالات دنیوی کا عوامی نگاہ سے جائزہ لینے کا سوال اگر کیا جائے تو جواب یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ یا دنیا کا کوئی نیک طبع انسان اس کا پابند نہیں۔ حضرت علیؑ کے نزدیک بھی تیرہ سو سال سے قبل یا بعد عوامی رائے کو کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اگر حق و صداقت، ایمان و حفاظت پیام و دعوتِ اسلام صحیح خد و خال میں بچ گئے۔ تو ان کی سیاست کامیاب ہے۔ ورنہ حضرت امیر علیہ السلام کا دورِ حکومت سامنے رکھتے ہوئے ہر ذی شعور شخص یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ انہوں نے اتنے پیچیدہ ماحول و عجیب و غریب رعایا میں اپنا کردار بے داغ چھوڑا ہے۔ اور آئندہ نسلوں کیلئے سبق چھوڑا ہے کہ سیاست کا مفہوم یہی ہے کہ سیاست کو دین سے الگ نہ سمجھا جائے۔

مفہوم سیاستِ مرتضوی کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں۔ بعض مورخین نے دورِ علیؑ پر جو تنقید کی ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ عموماً مندرجہ ذیل اعتراضات مرکز بحث ہوا کرتے ہیں۔

(۱) حضرت علیؑ نے قاتلانِ عثمان کو سزا نہ دی۔
(۲) گورنروں کو معزول کرنے کا حکم دے دیا۔

(۳) جمل و صفین میں مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان کروایا۔

(۴) دارالحکومت کو تبدیل کر لیا۔

آیئے! اِن واقعات کو فرداً فرداً تاریخ و عقل کی روشنی میں دیکھیں۔

حضرت علیؑ اور قاتلانِ عثمان

اِس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضرت عثمان کی کنبہ پروری سے تنگ آکر لوگوں نے انکو قتل کیا۔ اِس سلسلے میں حضرت علیؑ نے حضرت عثمان کی بسلسلہ پیاس جو امداد کی وہ روزِ روشن کی طرح ہے۔ حضرت عثمان کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ مدینہ کے بڑے بڑے اکابرین ان سے بغض رکھتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (جو خلیفہ گر عثمان تھے اور حضرت عثمان کی زندگی میں وفات پاگئے) طلحہ و زبیر، اُم المومنین حضرت بی بی عائشہ، بی بی حفصہ وغیرہ۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ مدینہ نے قتل عثمان کے معاملہ میں حضرت عثمان کی مدد نہ کی۔ اور تین دن تک انکا دفن و کفن نہ ہو سکا۔ رعیت کی اکثریت باغی تھی اور قتلِ عثمان پر خوش تھی۔ جن لوگوں نے قصاص کا غوغا اٹھایا تھا۔ وہ خود اس سازش میں شریک تھے۔ اب اگر قاتلانِ عثمان کو سزا دیجاتی تو سب اہلِ مدینہ اس میں آجاتے۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے۔ جب حضرت علیؑ نے قاتلانِ عثمان کی بابت پوچھا تو اہلِ مدینہ نے یکزبان یہ آواز بلند کی کہ وہ سب قاتلانِ عثمان ہیں۔ اس پوزیشن میں کُلی کا قاتلوں کو سزا دینا کیونکر درست تھا؟

دوسرے یہ کہ یہ ثابت ہی نہ ہو سکا کہ قاتل کون ہیں؟ آجتک تاریخ خاموش ہے اور کہ قاتلانِ عثمان کون تھے؟ جب قاتلوں کا علم ہی نہیں تو سزا کیسی؟ لیکن

پھر بھی حضرت نے مخالفین کو یقین دلایا کہ وہ قتلِ عثمان کی تفتیش فرمائیں گے۔ لیکن اُن لوگوں کا مدعا محض فساد تھا۔ اگر ان کا مقصد واقعی یہ ہوتا کہ قاتلانِ عثمان کو سزا دی جائے تو جب انھیں اقتدار حاصل ہوا۔ تو وہ ضرور اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھاتے۔ لیکن تاریخ میں کوئی واقعہ اس قسم کا نہیں ملتا کہ بنی اُمیہ نے حکومت سنبھال لینے کے بعد اس معاملہ پر ذرا سا غور بھی کیا ہو۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا، کہ انہوں نے قاتلانِ عثمان کو سزا نہ دی، بالکل جہالت ہے۔ کیونکہ قاتل کوئی خاص شخص یا جماعت ثابت نہ ہو سکی۔ اور نہ ہی یہ مقدمہ باقاعدہ حکومت کے سامنے آئینی طور پر پیش کیا گیا۔

عاملین کی معزولی

ہر ایڈمنسٹریٹر کا اصول ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار آتے ہی ماحول کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح جب حضرت علیؑ کو حکومت پیش کی گئی تو آپ نے اپنے نقطۂ نگاہ سے مُلک بھر میں اسکریننگ کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت علیؑ نظامِ مملکت کو اصول و قواعد کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ آپ کسی بھی مرحلے پر خلافِ شریعت عمل کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اسی لئے ضروری تھا کہ ان کے معاونینِ حکومت ایسے ہوں جو دنیوی جاہ و جلال کے بھوکے نہ ہوں۔ بلکہ ان کا مرنا جینا، سب اللہ کے لئے ہو۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے جسے جسے مناسب سمجھا اُسے معزول کر دیا۔ معاویہ بن ابوسفیان نے امامِ وقت اور خلیفۂ برحق کے خلاف بغاوت کر دی۔ ہر مؤرخ یہ تسلیم کرتا ہے کہ معاویہ نے خلیفۂ راشد کی مخالفت کر کے

سخت غلطی کی جبکہ تمام مسلمانوں کی نظر میں حضرت علی علیہ السلام رسولؐ کے برحق خلیفہ تھے خواہ پہلے یا چوتھے، بہرحال خلیفہ تھے۔ تو جب حضرت علیؑ نے بحیثیت خلیفۂ وقت معاویہ کی معزولی کا حکم نافذ فرما دیا تھا تو پھر اسکو شام پر قابض رہنے کا کیا حق باقی رہ گیا تھا؟ کیا خلیفۂ رسولؐ کی نافرمانی جائز تھی؟ کیا طاقت کے زور پر اسلامی حکومت کا شیرازہ بکھیر دینا اور سلطنت کو ٹکڑے کر دینا وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ .... کی آیت کی خلاف ورزی کرنا نہیں تھا؟ اور کیا حکمِ معزولی کے بعد مُلکِ شام پر قبضہ غاصبانہ نہ تھا؟

حضرت علیؑ جانتے تھے کہ معاویہ عیش پسند انسان ہے۔ اسے دین سے دنیا عزیز ہے۔ ماحول شام اس پر اثر انداز ہے۔ جیسا کہ معاویہ کے دورِ حکومت سے ظاہر ہے۔ لیکن حضرت علیؑ حکومت کو دینی حکومت بنانا چاہتے تھے۔ یہی منشاء خداوندی وسنّت رسولؐ تھا۔

باوجودیکہ معاویہ نے حضرت علیؑ کیلئے مشکلات پیدا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھا۔ لیکن اسلامی اصولِ سیاست کی رُو سے حضرت علیؑ کا معاویہ کو حکمِ معزولی بھیجنا چونکہ درست تھا۔ اس لئے حضرت علی علیہ السلام نے کسی مشکل کی پرواہ کیے بغیر اس حکم کو باقی رکھا۔

جنگِ جمل

حضرت طلحہ وزبیر نے حضرت علیؑ کی بیعت خوشی سے کی تھی بلکہ مؤرخین کہتے ہیں کہ سب سے پہلے طلحہ نے بیعت کی۔ کیونکہ طلحہ کا ہاتھ شل تھا۔ اس لئے بعض

نے اسے غلط شگون سمجھا، لیکن جب حضرت علیؑ نے انہیں کوئی عہدہ نہ دیا۔ تو یہ بغاوت وانتشار پر تل گئے۔ قتلِ عثمان کے وقت یہ لوگ حضرت عثمان کے سخت مخالف تھے۔ لیکن اب انہوں نے قصاصِ عثمان کا نعرہ بلند کیا۔ اصولی طور پر انکا قصاصِ عثمان سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ یہ نہ تو حضرت عثمان کے ورثاء میں تھے اور نہ ہی ہمدرد دوست۔ انھیں کی بدولت اُمّ المومنین عائشہ، خدا ورسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے حضرت علیؑ کے مقابلے پر میدانِ جنگ میں آگئیں انہوں نے پہلے بصرے کا محاصرہ کیا۔ اور حضرت علیؑ نے دفاعی جنگ کی۔ جنگ کے بعد حریفوں سے حضرت علیؑ کا سلوک رواداری، صبر وتحمّل کی آخری معراج ہے۔ حضرت زبیر نے میدانِ جنگ میں یہ تسلیم کر لیا کہ ہم حق پر نہ تھے۔ اور بی بی عائشہ ساری عمر اپنے کیے پر پچھتاتی رہیں۔ کوئی بھی مورّخ آج تک یہ ثابت نہ کر سکا کہ جنگِ جمل میں حضرت علیؑ حق پر نہ تھے۔ لہٰذا جنگِ جمل کے نقصان کے اصل ذمّہ دار مخالفینِ علیؑ تھے۔

جنگِ صفّین

شائقینِ تاریخ سمجھتے ہیں کہ معاویہ خود خلیفہ بننے کا خواب دیکھتا تھا اور اپنی طاقت کو ناجائز طریقے سے بڑھا رہا تھا چنانچہ اس نے قومی دولت کو اندھا دھند لٹا کر لوگوں کو خریدنا شروع کیا۔ حضرت علیؑ کو منبروں پر سبّ وشتم کروا کے لوگوں کے دلوں سے اہلبیتؑ کی محبت نکالنا چاہی۔

جب معاویہ نے حضرت علیؑ کو جمل کی مہم میں دیکھا تو اس نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ حضرت علیؑ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ مصر وغیرہ پر حملہ کر دیا۔ حضرت نے

خطوط کے ذریعے اسے بہت تنبیہہ کی۔ اور جارحانہ عزائم سے باز رہنے کی تلقین فرمائی لیکن آخر کار یہ میدان میں آ نکلا۔ لہٰذا حیدرِ کرار کے لئے دفاع ضروری ہو گیا۔ نتیجۃً گھمسان کا رن پڑا جو ہوا سو ہوا۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس لڑائی میں بھی تاریخ یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ حضرت علیؑ حق پر نہ تھے۔ اگر کوئی شخص بھی ایسے حالات میں بادشاہ یا خلیفہ ہوتا تو دفاعی لڑائی ضرور کرتا۔ جمہور انھیں خلیفہ تسلیم کر چکا تھا۔ اور معاویہ ایک خطرناک باغی تھا۔

دارالخلافہ کی تبدیلی

حضرت علیؑ نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دارالحکومت کیوں بنا لیا؟ اسکی کئی وجوہات ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(ا) زمانۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں اسلامی سلطنت اتنی وسیع نہ تھی جتنی زمانۂ علیؑ میں تھی۔ کیونکہ کوفہ شہر سلطنتِ اسلامیہ کا مرکزی شہر تھا اس لئے دورِ جنابِ امیرؑ میں اس سے بہتر کوئی شہر دارالخلافہ بننے کے قابل نہ تھا اور مدینہ میں رہنے سے ملکی دیکھ بھال میں دقت ہوتی۔

(ب) چونکہ مدینہ باعظمت شہر تھا اور حضرت علیؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ شہر سیاسی تنازعات کا مرکز بنے۔ حضرتِ عثمان کے واقعات آپ کے پیش نظر تھے اور آئندہ کیلئے اس محترم شہر کی عزت کا احساس کرتے ہوئے آپ نے یہی مناسب سمجھا کہ مدینۃ النبیؐ کو دارالخلافہ سمجھ کر کوئی باغی لشکر مدینہ پر حملہ آور ہو کر اسکی حرمت برباد نہ کرے۔

(ج) دارالحکومت میں ہر قوم و ملت کے افراد کی آمد و رفت ہوتی ہے اس لئے

وہاں کی زبان خالص نہیں رہتی اور تہذیب و تمدن پر بھی غیر ملکی اثرات پڑتے ہیں لہٰذا حضرتؑ نے یہی چاہا کہ مدینہ کو دارالسلطنت نہ رہنے دیا جائے۔ تاکہ وہاں کی فصاحت و بلاغت کو آمیزش سے بچایا جائے۔ اور مدینہ اسلامی تہذیب و تمدن کا نمونہ رہ سکے۔ ح۱

(د) جنگی حالات کے پیش نظر حضرت علیؑ کے لئے کوفہ ہی موزوں دفاعی مقام تھا۔ جہاں سے وہ اپنے باغیوں کی سرکوبی آسانی سے کر سکتے تھے۔

(ہ) کوفہ ایک عظیم تجارتی منڈی تھی اور ہر ملک و قوم کے تاجر پیشہ لوگ وہاں آتے تھے۔ اس لئے اشاعت اسلام کی خاطر آپ نے اس شہر کو تبلیغی مرکز بھی بنایا اور دین الٰہیہ کی تعلیم فرماتے رہے جو کہ اصل مقصد تھا۔

ان معروضات کے بعد یہ کہنا کہ علی علیہ السلام کو سیاست (معاذ اللہ) آتی نہیں تھی۔ درست نہیں اور اسے میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ علیؑ کو دھوکہ دہی اور بے ایمانی کی سیاست واقعی پسند نہیں تھی۔ کیونکہ وہ کفار و منافقین کی تھی انہوں نے خود فرمایا کہ "اگر میرے پاؤں میں دین کی زنجیر نہ ہو تو میں سب سے بڑا چالاک ہوں" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جناب امیر علیہ السلام اپنے حریفوں کے سے ہتھکنڈے استعمال کرنا منافیٔ ایمان سمجھتے تھے۔

بس ایک واقعہ لکھ کر ختم کرتا ہوں کہ آپؑ کے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ تشریف لاتے ہیں اور اپنے بھائی (جو کہ خلیفۂ وقت ہیں) سے التماس کرتے ہیں کہ میرا وظیفہ بڑھا دیجئے کہ اس پر میرا بسر اوقات مشکل سے ہوتا ہے تو آپؑ فرماتے ہیں "کیونکر تمام مسلمانوں کے مال کی چوری کر کے آپ کا وظیفہ بڑھا دوں"۔ یہ جواب سن کر عقیلؓ واپس آ جاتے ہیں۔ محض مالی تنگی کی وجہ سے معاویہ کے پاس

ح۱ آج بھی سعودی عرب کا دارالسلطنت مکہ یا مدینہ نہیں بلکہ ریاض ہے

چلے جاتے ہیں۔ جناب عقیلؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو دنیاوی عیش کی ضرورت ہو تو معاویہ کے پاس چلا آئے اور دین کی بہار دیکھنی ہو تو میرے بھائی علیؑ کے پاس جائے۔ یہی وجہ تھی کہ معاویہ کی لاکھ کوشش کے باوجود۔ جناب عقیلؓ نے حضرت علی علیہ السلام پر سبّ و شتم نہیں کی، اور نہ ہی ان کی مخالفت میں کوئی قدم اٹھایا ؎

آخر میں دعا ہے کہ پروردگارِ عالم
بحقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ ہم سب کو
صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ اور
نیک اعمال کی توفیق بخشے ؎

(والسّلام والدّعاء)

خاکپائے حیدرِ کرارؑ۔ عبدالکریم مشتاق
المرقوم ۷ نومبر ۱۹۶۲ء بوقت ۸ بجے شب

کعبہ میں دو عالم کے ولی آتے ہیں
وہ صاحبِ آیاتِ جلی آتے ہیں
اب وقت کسی کے سر اٹھانے کا نہیں
جھک جائیں بلندیاں علیؑ آتے ہیں

عیدِ میلادِ علیؑ کے جشنِ مبارک پر پڑھا گیا۔ تبرکاً پیش کیا گیا

طبع ثانی

رسالہ ہذا ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ لاہور سے طبع ہوا تھا اب قارئین کے اصرار پر اسے دوبارہ پیش خدمت کیا جا رہا ہے اور گذشتہ ایڈیشن میں جو خامیاں رہ گئی تھیں انکو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم ناظرین کرام اپنے مفید مشوروں اور اصلاحی ہدایات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے حوصلہ افزائی فرمائیں ؎ ———— (شکریہ)

آلِ رسولؐ بزبانِ وصیِّ رسولؐ

وہ (آلِ محمد علیہم السلام) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رازدار، آپ کے امر کی پناہ گاہ، اور علمِ رسولؐ ودیعت گاہ، حکمتِ رسولؐ کے ملجا و ماویٰ اور کتابوں و رسولؐ کی حفاظت کے لئے پہاڑ ہیں یہی ہیں۔ وہ (اہلِ بیتِ رسولؐ) جنھوں نے دین کی جھکی ہوئی پشت کو سیدھا کیا، بازوئے اسلام کی لرزش انہی (آلِ محمدؐ) کے دم سے دور ہوئی۔

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲)

آلِ رسولؐ اور اُمتِ رسولؐ

تم نے تاریکیوں میں ہمارے ہی باعث سے ہدایت پہچانی۔ ہمارے ہی سبب سے تمہارے سر اونچے نظر آتے ہیں۔ ہماری ہی وجہ سے تم نے رات کے اندھیرے (ضلالت کی تاریکی) میں صبح کا اجالا (اسلام) پایا۔ وہ کان بہرے ہو جائیں جو اپنے (ہادی و رہنما کی) سننے والی بات نہ سنیں۔ لیکن وہ کان ہلکی آواز کیسے سن سکتا ہے۔ جو چیخ سے بہرہ ہو چکا ہو۔ (یعنی دلوں پر قفل لگ گیا ہو) خدا اس دل کو سکون عطا کرے جو خوفِ خدا سے لرزتا ہے اور ڈرتا ہے۔ میں ہمیشہ تمہارے ان نتائج کا منتظر ہوں جو خیانت، بدعہدی اور بے وفائی کے سبب برآمد ہوں گے۔ اور میری نگاہِ بصیرت تم میں فریب کاری دیکھ رہی تھی۔ لیکن لباسِ تقویٰ اور پیرہنِ دینداری نے مجھے تم سے پنہاں رکھا۔ میرے باطنی صفات نے تمہارا حال مجھ پر منکشف کر دیا۔ میں بھٹکانے والے

راستوں میں تمہارے لئے راہِ حق پر کھڑا ہو گیا۔ جب تم رہبر ڈھونڈتے تھے مگر کوئی رہنما نہ تھا۔ تم کنوئیں کھودتے تھے مگر پانی نہیں نکلتا تھا۔ (یعنی میں نے تمہیں ہلاکت و گمراہی سے نجات دی) آج میں تمہارے لئے حقائق بیان کر رہا ہوں۔ اس شخص کی رائے کوئی رائے نہیں ہے جس نے مجھ سے کنارہ کشی کی۔ جب سے مجھے حق کا جلوہ دکھایا گیا ہے۔ مجھے کبھی اس میں شک پیدا نہیں ہوا ہے۔ (یعنی میں ہمیشہ ثابت قدم رہا۔ اور باطل نے کبھی میرے دل میں راہ نہ پائی) موسیٰ کو خوف اپنی جان کا نہ تھا، بلکہ خطرہ جو کچھ تھا یہ تھا کہ جاہل غلبہ نہ پکڑ لیں اور گمراہوں کو اقتدار حاصل نہ ہو جائے۔ ہم دونوں (میں اور میرے مخالفین) آج حق و باطل پر کھڑے ہیں (یعنی میں راہِ حق پر اور تم راہِ باطل پر) اب جو شخص پانی پر اعتماد کرے گا ہرگز پیاسا نہ رہے گا۔ (یعنی جو میری گفتار و کردار کی پیروی کرے گا، نجات پائے گا) .... (نہج البلاغہ خطبہ ۴)

غیر اہلِ بیت کا تعارف بزبانِ قائدِ اہلِ بیتِ نبوی

یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے نافرمانی کا بیج بویا۔ غفلت اور فریب کے پانی سے اسے سینچا پھر اس کھیتی کی فصل کاٹ کر اپنے لئے ہلاکت مہیا کی۔ آلِ محمد علیہم السلام کا اس امت میں کسی پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا جن پر انہوں نے ہمیشہ احسان کئے۔ ان کو کبھی بھی ان لوگوں کے برابر نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

آلِ رسولؐ، اساس۔ پایہ اور ستونِ ایمان و یقین ہیں۔ راہِ حق سے دور ہونے والے انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور تھک کر (پیچھے) رہ جانے والے انہی سے آکر ملتے ہیں۔ فرائض (منصب) امامت انہی کی ذات میں مجتمع ہیں۔ ان ہی میں وصیت اور

وراثت ہے۔ اَب حق اپنے اہل کی طرف واپس آچکا ہے۔ اَور جو اس کا مقام تھا۔ وہاں پہونچ چکا ہے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۲)

خطبۂ شقشقیہ

خبردار، اللہ کی قسم، ابو قحافہ کے فرزند (حضرت ابوبکر) نے پیراہن خلافت زبردستی پہن لیا۔ حالانکہ وہ خوب واقف تھے کہ مَیں اَمر خلافت کیلئے اتنا اہم اور ضروری ہوں جتنا کہ چکی کے لئے وہ کھونٹا جس پر اس کی گردش کا انحصار ہوتا ہے۔ میرے (سرچشمۂ فیض سے علم وعرفان) مانندِ سیل گرتے ہیں۔ اَور کوئی بھی پرواز کرنے والا (فضائے علم وحکمت دانش وہدایت میں) میرے اَوجِ رفعت کو نہیں چھو سکتا ہے۔ مگر مَیں نے (چشم پوشی) سے کام لیا۔ اور (اَمر حکومت سے) منھ موڑ لیا۔ اور سوچا کہ بغیر یار ومددگار کے اَپنے حق (حکومت) کا مطالبہ کروں؟ یا اس سخت مصیبت میں صبر سے کام لوں کہ جس نے بوڑھوں کو ناکارہ اور جوانوں کو بڈھا بنا دیا ہے۔ مومن (فساد دُور کرنے کے لئے) رنج برداشت کرتا ہے۔ حتّٰی کہ خدا کو جاملے۔ مَیں نے دیکھا کہ صبر کرنا ہی عقل مندی کے قریب تر ہے۔ میں نے صبر و استقلال کیا، حالانکہ آنکھ خاشاک وغبار سے اَور حلق وگلا سخت تکلیف میں تھا۔ مَیں اَپنی میراث کو غصب وتاراج ہوتے دیکھتا رہا۔ (یعنی ایسے پُر آلام ومصائب سے بھرپور حالات کو سکوت وخاموشی سے دیکھتے رہنا، اِنتہائی تکلیف دِہ تھا۔ مگر مَیں نے صبر کرنا ہی ضروری سمجھا۔)

یہاں تک کہ اَوّل (حضرت ابوبکر) نے اپنی راہ پائی (یعنی فوت ہوئے)

اَور خطّاب کے بیٹے (حضرت عمر) کو اَپنا والی مقرر کر گئے، بعد اَپنے۔ بہ قول اَعشیٰ (مشہور عربی شاعر) اِن دونوں دِنوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ آج کہ مَیں کوہانِ شتر پر سوار ہوں اور رنج وسختی میں مبتلا ہوں، اور کہاں وہ دِن کہ اَپنے قدیم حیان[۱] بھائی جابر کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ اَوّل (حضرت ابوبکر) اپنی زندگی میں لغزشوں سے بچنے کی خاطر دوسروں کی مدد کے طلبگار تھے۔ یا پھر یہ ہوا کہ اَپنے اِنتقال کے بعد وہ حکومت کی وصیّت ایک دوسرے شخص کے لئے کر گئے (یعنی حضرت عمر کیلئے) ان دونوں نے (شیخین نے) یکے بعد دیگرے (حکومت) کے تھن دوہ لئے، اور اس طرح حکومت کی اونٹنی کو درشت وناہموار جگہ پر ڈال دیا۔ جہاں اس کے زخم اور زیادہ رِسنے لگے۔ اَور ہاتھ لگانا تک مشکل ہو گیا۔ اب (اس راہِ حکومت میں) لغزشیں بڑھ گئیں جن کے بارے میں طرح طرح کے عذر تراشے گئے۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والا اس سوار کی مانند تھا۔ جو ایسے سرکش اونٹ پر سوار ہو کہ اگر مہار زیادہ کھینچی جائے تو بینیِ شتر مجروح ہو جائے اور ڈھیلی چھوڑ دی جائے۔ تو اپنی موت کا سبب بنے۔ خدا کی قسم! لوگ گھبراہٹ اور دیوانگی، رنگا رنگی اور رکاوٹوں میں آزمائے گئے۔ میں نے اس لمبی مدت میں شدتِ مصائب وتکالیف پر صبر وضبط سے کام لیا۔ (سکوت اختیار کیا) یہاں تک کہ یہ دوسرے صاحب بھی چل بسے۔ اور معاملہ حکومت ایک جماعت شوریٰ میں محصور کر دیا۔ جس کا ایک فرد ان کے گمان میں خود میں تھا۔ اللہ بھلا کرے مجھے اِس

---

[۱] حیان برادر جابر، شہر یمامہ کا رئیس اور بزرگِ قوم تھا۔ جو شاعر اَعشیٰ کا گہرا دوست تھا، جناب امیرؑ نے اس شعر سے زمانۂ رسولِ مقبول کی طرف اِشارہ فرمایا ہے۔

(شوریٰ) سے کیا مطلب کہ میں ان جیسی (غیر معتدل) باتوں میں پڑتا؟ لیکن مصلحتاً نشیب و فراز میں ان کے ساتھ ساتھ چلا۔ اسی گروہ (جماعت شوریٰ) میں سے ایک شخص (سعد بن وقاص والدِ عمر بن سعد جرنیل یزیدؓ) تو مجھ سے اپنے بغض کے باعث پھر گیا۔ اور دوسرا عثمان سے رشتۂ دامادی کے باعث مجھ سے اعراض کر گیا۔ (عبدالرحمٰن بن عوف مراد ہیں جو حضرت عثمان کے بہنوئی تھے) اور بعض دوسرے ناگفتہ بہ حالات میں مجھے کترا گئے۔

آخر کار قوم کا تیسرا شخص پیٹ پھیلائے اپنے گوبر اور چارے کے درمیان میں کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ اُس کے بنی اُمیہ (جدی قرابتدار) بھی ہو گئے۔ اور اللہ کا مال اس طرح صرف کرنے لگے جس طرح اونٹ موسم بہار کا سبزہ چرتا ہے یہاں تک کہ اسکی رسّی کے بل بھی کھل گئے (بیت المال کا صفایا کر دیا) اور اسکا کام بھاری ہو گیا۔ اور بسیار خوری کے باعث منہ کے بل گر گیا۔

پس قتل عثمان کے بعد (کسی چیز نے مجھے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا اس بات نے کہ لوگ اس کثرت سے مجھ پر (بیعت کے لئے) ٹوٹے پڑ رہے تھے جیسے بجو کے گردن کے بال، یہاں تک کہ حسنؑ و حسینؑ (اس انبوہ کثیر سے) کچل گئے۔ اور میری چادر پھٹ گئی۔ یہ لوگ میرے گرد گلۂ گوسفند کی طرح جمع ہو گئے۔ پھر جب میں بیعت کے لئے اٹھا اور امرِ حکمرانی میں مشغول ہوا تو ایک جماعت نے میری بیعت کو توڑ دیا۔ (یہ طلحہ و زبیر کی طرف اشارہ ہے) اور ایک دوسرا گروہ بھی دائرۂ بیعت سے خارج ہوا۔ کچھ اور لوگ بھی جادۂ حق سے منحرف ہو گئے جیسے ان (متخلفین) نے خدا کا یہ کلام سنا ہی نہ تھا کہ "آخرت ان کیلئے ہے جو زمین میں فتنہ و فساد نہیں کرتے اور نیک جزا ہے عاقبت متقیوں کیلئے ہے۔" ہاں خدا کی قسم! انہوں نے سنا اور اچھی طرح سنا مگر یہ سجی ہوئی دنیا اور زمانہ کی زینت

انہیں زیادہ پسند ہے چنانچہ یہ حق سے ہٹ گئے۔ سرکشی اختیار کر لی اور دنیا آشوبِ فنا میں مبتلا کر دیا۔ اور ہاں لوگو!

اُس خدا کی قسم! جس نے دانہ کو چیرا اور جس نے انسان کو خلق کیا اگر لوگ اس تعداد کثیر کے ساتھ حاضر نہ ہوتے (اور میری بیعت نہ کر لیتے) اور حواریوں کی وجہ سے مجھ پر حجّت تمام نہ ہو جاتی اور صاحبانِ علم سے اللہ کا یہ عہد نہ ہوتا کہ وہ ظالم کی شکم سیری (ظلم) اور مظلوم کی گرسنگی (مظلومیت) پر راضی نہ ہوں تو بلاشبہ ناقۂ حکومت کی مہاریں اُسی پیٹھ پر ڈال دیتا کہ وہ اونٹنی جدھر جائے جس خار زار کو چاہے چراگاہ بنائے۔ اور راہِ ضلالت و گمراہی میں پڑ جائے۔ اور بلاشبہ اسکے بعد بھی اسے وہی کاسۂ آب دیتا جو پہلے دے چکا تھا۔ اور تم جان لیتے کہ تمہاری یہ دنیا میرے نزدیک بکری کی چھینک سے بھی زیادہ حقیر ہے۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۳)

اس خطبہ میں امیرالمومنین علیہ السلام نے ان مسائل پر گفتگو فرمائی ہے جو ان کی ذاتِ گرامی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان حالات کا ذکر کیا ہے جو براہ راست انھیں پیش آئے۔ ان صدمات کا بیان فرمایا ہے جو مسلمانوں کی طرف سے بار بار پیش آئے اس طرزِ عمل کا گلہ کیا ہے جو یاروں کی طرف سے ظہور میں آیا۔ اپنے صبرِ جمیل اور ضبطِ حسین کا اظہار فرمایا ہے۔ ہر طرح کے نامساعد حالات میں بھی آپ کے ہاتھ سے جس کا دامن نہیں چھوٹا اس استحقاق کا ذکر انتہائی پُردرد لہجہ میں کیا ہے جس کا آپ خود کو مستحق سمجھتے تھے۔ مگر آپ کے اس حق کو تسلیم نہ کیا گیا۔ ظاہر ہے یہ باتیں تلخ ہیں اور جب کسی تلخ حقیقت کا تذکرہ مقصود ہوگا تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس میں جذباتی تلخی کارفرما نہ ہو۔ لیکن پھر بھی سارا خطبہ ملاحظہ کر لیجئے کہیں بھی کوئی ایسا "جملہ یا لفظ" نہیں ملے گا جو حدِ اعتدال سے متجاوز ہو۔

کہیں بھی کوئی ایسی بات محسوس نہ ہوگی جس کی تصدیق تاریخ سے نہ ہو۔ بلکہ ایک حرف بھی ایسا نظر نہ آئے گا جو "ناحق" کے ذیل میں آسکے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے اس خطبہ کو نقل کرنے کا مقصد محض یہی ہے کہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے قارئین پر حضرت امیر علیہ السلام کی سیاست کا وہ تدبّر سامنے آجائے جو انھوں نے حزبِ اختلاف کی حیثیت میں پیش کیا۔ اور حزبِ اختلاف کے عادلانہ کردار کا وہ سانچہ مہیّا فرمایا جو اپنا لوہا منوائے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس موضوع پر مدلّل و تفصیلی گفتگو ہم اپنی کتاب "صرف ایک راستہ" کے باب سیاسیات میں ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں اور عنقریب دوسرے رسالے "علیؑ اور سیاست" میں بعض جدید مباحث پیش خدمت کریں گے۔ والسلام۔

احقر

عبدالکریم مشتاق

۴ فروری ۱۹۷۸ء

3/G/11/8 ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸

(تحریر بخط سید محمد حسن عسکری زیدی خادم ایرانی)



باوا علی زر نقوی (مرحوم) اِسلامک ریسرچ سنٹر (فیصل آباد)